نجمی نے ایک لمبا سانس لیا اور سادگی سے ہنسی۔ اس کی بے راز ہنسی اور پرانی بے تکلف آنکھیں دیکھ کر خالد کا دل سرد پڑ گیا۔

''تم محبت کو کیا سمجھتے ہو؟'' آخر اس نے پوچھا۔

''میں کچھ نہیں سمجھتا۔ مجھے کچھ علم نہیں نجمی' صرف اتنا پتا ہے کہ تم مجھے بے چین کر دیتی ہو۔ تمہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ میں...... کہ جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا یا کیا......''

''تو اس کا علاج ہے کہ دیکھنا ہی بند کر دو۔''

''دیکھنا ہی؟'' خالد نے سانس روک کر پوچھا۔

''ارے ہائے خالد۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''کیا ہو گیا ہے۔ کیا ہو گیا ہے؟'' وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے چیخا۔ ''تمہیں پتا نہیں؟ تم کچھ محسوس نہیں کرتیں؟ تم اتنی لاعلم ہو؟۔ اتنی حسین۔'' ہوا تیزی سے درختوں میں چلنے لگی: سائیں۔ سائیں۔ سائیں!

وہ تھا وہ اپنی آواز اور جذبے کی شدت سے خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے اس کے کندھے چھوڑ دیے اور ششدر دیکھنے لگا۔ نجمی پشت اور دونوں بازو درخت سے چپکائے پنجوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ ہوا کا [illegible]

''وہ تو...... تو......'' خالد بے حد غیر حاضر اور خشک آواز میں پکارا۔

ہوا پھر درختوں میں رک گئی تھی اور یوکلپٹس کے جنگل پر شام آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ رات کا ایک سیاہ خاموش پرندہ آ کر درخت پر بیٹھ گیا۔ ایک گلہری دوڑتی ہوئی نیچے اتری۔ نجمی آواز پیدا کیے بغیر درخت کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

''جاؤ'' وہ بھرائی ہوئی وحشت زدہ آواز میں بولی۔

خالد نے اندھیرے میں اس کی طرف دیکھا اور خاموش بیٹھا رہا۔ وہ احتیاط سے چلتی ہوئی جا کر پتھر پر بیٹھ گئی۔ بڑی دیر کے بعد اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

''خالد۔ اب تم جاؤ۔'' اس نے پر سکون آواز میں کہا۔

''میں کبھی اتنا بے قابو نہیں ہوا۔ تم جانتی ہو نجمی۔''

وہ خاموش بیٹھی اندھیرے میں چلتی ہوئی ہوا کے ہلکے شور کو سنتی رہی۔ ایک لمحے کو اسے خیال ہوا کہ وہ پہلی دفعہ اس جنگل میں آئی ہے لیکن وہ آرام سے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے وہیں بیٹھی رہی کیونکہ وہ ایک طوفان خیز جذبے میں سے گزری تھی اور اس کے دل میں شدید اداسی تھی اور تنہائی اور بے چینی! اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس سیاہ کپڑے ہیولے پر اسے ترس آنے لگا اور اس نے وہ سب کچھ کہہ دینا چاہا جو کہ اس نے محسوس کیا تھا۔

''تم محبت کا ذکر کر رہے تھے خالد۔ میں تمہیں بتاؤں کہ محبت کے بارے میں کیا محسوس کرتی ہوں۔'' وہ رکی۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک ایسی شے ہے جو اکثر انسانوں کو دھوکا دیتی ہے۔ اکثر انسان محبت کا مطلب سمجھ لیتے ہیں' بہت کم در حقیقت اسے پاتے ہیں۔ محبت ہمارے سمجھدار ہو جانے کے ساتھ ہی ساتھ نہیں آ جاتی' یہ کسی وقت بھی آ سکتی ہے اور ایک جذبے کی صورت میں آتی ہے۔ ہم لوگوں سے ملتے ہیں اور ملتے رہتے ہیں اور کسی ایک کو پسند بھی کرتے ہیں مگر یہ محبت نہیں ہوتی۔ محض ہمارا دماغ' جو محبت کے نام سے واقف ہے اور اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے اس کمزور سی کشش کا باعث ہوتا ہے۔ جب وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں تو ہم بھول جاتے ہیں۔ ہم ہر کسی سے محبت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ محبت جو سادگی اور سچائی کا جذبہ ہے جب آتا ہے تو ہمیں دنیا سے اوپر لے جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو ہم کسی ذہنی یا جسمانی قوت کی مدد سے حاصل نہیں کر سکتے' جو روح کی تمام تر قوتیں لے کر آتا ہے' جس میں سے مذہبی راہنما گزرتے ہیں۔ یہ ہمارے مخلص ترین جذبوں میں سے ہے۔ میں جذبے کی بات کر رہی ہوں۔'' ایک آواز کے علاوہ اس نے صاف طور پر اپنے سر پر ہوا کے ہلکے شور کو سنا اور خاموشی ہو گئی۔ ان کے گرد گھپ اندھیرا تھا اور سیاہ گرم ہوا میں آہستگی بھی تیزی سے چل رہی تھیں۔ روشن محل کی روشنیاں دیر ہوئی جل چکی تھیں اور اندر چلتے پھرتے ہوئے لوگوں کا عکس شیشوں پر پڑ رہا تھا۔ بوڑھا مالی بڑ کا پائپ اٹھائے سائے کی طرح جنگل کے کنارے کنارے گزر گیا۔

''[illegible] خالد [illegible]''

''بیوقوف مت بنو۔ میں سچی بات کرتی ہوں۔ ہم اس کے اہل نہیں ہیں۔ ہمیں اس قدر سچائی' اس قدر خلوص کے ہم اہل کہاں ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں خالد میری کئی ایک دوست ہیں جو اس طمانیت سے زندگی بسر کر رہی ہیں جیسے سچ مچ خوش ہیں۔ انہوں نے خوبصورت تندرست نوجوانوں کو دیکھا اور ان سے شادیاں کر لیں۔ اب وہ اگر تصویریں بنانے کے لیے بیٹھتی ہیں تو وہ الگ بیٹھ کر تمباکو پیتے ہیں اور دل میں اپنی بیوی کو کوستے ہیں۔ وہ اگر پیانو پر بیٹھتی ہیں تو وہ خوابگاہ کا دروازہ بند کر کے سو جاتے ہیں یا ووٹین کے لیے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنی نظم سناتی ہیں تو وہ الوؤں کی طرح منہ دیکھتے ہیں اور گلا پھاڑ کر ہنستے ہیں۔ وہ اصل زندگی کو آہستہ آہستہ بھول جاتی ہیں اور پھر کمتر راحتوں کے لیے اپنے خاوندوں کی طرف راغب ہوتی ہیں۔ وہ ان سے محبت کرتی ہیں کیونکہ وہ انہیں عمدہ عمدہ لباس خرید کر دیتے ہیں یا دور دراز مقامات پر تفریح کے لیے لے جاتے ہیں یا ہر سال نئی کار خریدتے ہیں یا ہل اسٹیشنوں پر مکانات تعمیر کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی مسرتیں اور آسائشیں ہیں جو ان کے شوہر ان کے لیے خرید سکتے ہیں اور جن کی وہ ان سے توقع رکھتی ہیں۔ وہ خوش ہیں کہ ان کے بچے ہیں اور ایک شخص ہے جو ان کے بچوں کا باپ ہے اور ان کا ایک مکمل' مطمئن خاندان ہے۔ وہ خوش ہیں کیونکہ وہ جانتی ہی نہیں کہ کسی اور کے ساتھ وہ اس سے کہیں بہتر طریقے پر زندگی گزار سکتی تھیں۔ وہ ان بلیوں اور خرگوشوں اور دوسرے پالتو جانوروں کی طرح ہیں جو ہر اس شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں جو ان کو کھانا کھلاتا اور نہلاتا ہے۔ تم نے دیکھا

ہیں۔" اس نے خوشی سے سوچا' پھر اس نے کئی دن سے اس کو دیکھنے کے لیے نہ جا سکنے پر اپنے آپ کو ملامت کی اور فیصلہ کیا کہ صبح سویرے وہ اس کی خیرت پوچھنے جائے گی۔

روشن آغا کے بعد شاید نعیم ہی ایک ایسا شخص تھا جس سے وہ اس درجہ مرعوب' کسی حد تک خوفزدہ تھی۔ اس کے بارے میں اس کا فیصلہ تھا کہ وہ کبھی اس کے قریب نہ ہو سکتی تھی' کہ وہ بے حد مختلف قسم کا پُر اسرار انسان تھا۔ لیکن اس اسرار نے عجمی کے دل میں اس کے لیے عقیدت اور احترام پیدا کر دیا تھا۔ وہ اس کے لیے پُر کشش اور رنگین ماضی لیے' خوبصورت اور ذہین' کسی حد تک لاوارث عزیز تھا۔ عجیب بات تھی کہ آج تک عجمی نے نعیم کے بارے میں عذرا کے واسطے سے کبھی نہ سوچا تھا۔ عذرا کی اپنی الگ' بے حد مختلف' تنہا شخصیت تھی۔

تیز ہوا کے ساتھ بارش کے پہلے قطرے اس کے ماتھے پر گرے اور وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

اندر پرویز کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ باہر خالد کے ساتھ گپیں مار رہی تھی۔

"گپیں یا گپ بازی۔ تفصیل کے ساتھ بتاؤں۔" عجمی نے کان کھجا کر کہا۔

"خالد۔ خالد۔" کئی لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔ خالد کو بلانے کے لیے کئی نوکر دوڑائے گئے لیکن وہ نہ ملا۔ پھر اس کی بدتمیزی اور نالائقی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے انہوں نے کھانا شروع کیا۔

UrduPhoto.com

(۴۷)

وہ ایک غیر معمولی گرم شام تھی جب وہ نعیم کو لے کر سبزے پر اتر آئی اور آہستہ آہستہ اسے چلانے لگی۔ برابر کے لان میں وہ سب تاش کے کھیل سے اکتا کر اب کاہلی سے ٹانگیں میزوں پر رکھے گپیں مار رہے تھے اور بیچ بیچ میں زور زور سے ہنسے جاتے تھے۔ ہوا تھم گئی تھی اور ان کے اردگرد گھاس کی گرم' مرطوب خوشبو رکی ہوئی تھی۔

کئی بار کہا ہے نچلی منزل میں آجائیں۔ ہر بار سیڑھیاں طے کرنا پڑتی ہیں۔" نعیم نے ہانپتے ہوئے جھک کر عذرا کا سہارا لیا۔

"اب تم جلد اچھے ہو جاؤ گے۔" عذرا نے کہا۔

لان کے وسط میں رک کر نعیم نے پسینہ خشک کیا اور ہاتھ اٹھا کر پرویز کو جواب دیا جو کرسی پر لیٹا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ عذرا نے منہ پھیر لیا۔

"پرویز خوش اخلاق ہوتا جا رہا ہے۔" اس نے حقارت سے کہا۔

اب وہ سب ان کی طرف متوجہ ہو کر زور زور سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ نعیم نے چھڑی والا ہاتھ اٹھا کر سب کو جواب دیا۔ "نہیں عذرا' اچھے لوگ ہیں۔" اس نے کہا۔

وہ خاموشی سے اس کو سہارا دیئے چلتی رہی۔

''پرویز کل میرے پاس بیٹھا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا جنگ پھر چھڑ گئی ہے۔ ہندوستان پر مصیبت آئے گی۔''

''کب آیا تھا؟ پار سال؟'' عذرا نے طنز سے پوچھا۔

''بیوقوف مت ہو۔ جنگ چھڑے ہوئے ایک ہفتہ ہوا ہے۔ مجھے پوچھنے آیا تھا۔''

''میرے سامنے کیوں نہیں آتا'' عذرا نے غرا کر کہا۔ ''وہ عورت۔ اس کی بیوی!''

نعیم نے اس بازو سے جو عذرا کے شانوں پر تھا' اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور مڑ کر چلنے لگا۔ عذرا نے ذلت کے آنسو چھپانے کے لیے اس کے مصنوعی بازو کو ہاتھوں میں لے کر دبایا' یہاں تک کہ اسے ڈر محسوس ہونے لگا کہ وہ ٹوٹ جائے گا۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے سیڑھیاں چڑھنے کی ورزش تمہارے لیے مفید ہے۔''

نعیم نے بے خیال ہو کر ایک لمبا سا 'اوہ' کیا۔ ''ڈاکٹر ڈاکٹر ڈاکٹر۔ مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔'' اس نے رک کر عذرا کو پیار اور اداسی سے دیکھا۔ ''مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے۔''

''پتا نہیں نعیم' یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے مجھے۔ ایک دفعہ جب تم نہیں تھے تو میں نے کمرہ تبدیل کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب انہوں نے میرا سامان باہر نکالا تو مجھے یوں لگا جیسے میں باہر جا رہی ہوں۔ میں گھر سے باہر ہمیشہ کی جلاوطنی [illegible] کہاں۔ مجھے عجیب سا غریب الوطنی کا احساس ہوا۔ اپنے سامان کو باہر پڑا دیکھ کر میرا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر [illegible] ہوئی اور اپنے قدموں کی چاپ مجھے دیواروں میں سے آ رہی تھی جہاں سے ساری تصویریں اتار لی گئی تھیں۔ اور آتشدان ننگا تھا' سرد اور ٹھوس اور [illegible] میں نے اسے چھوا۔ اور دریچہ صرف دریچہ تھا جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا۔ پتا ہے نعیم' کمرہ خالی ہو چکا تھا' اجنبی اور ویران' لیکن دریچے میں یوکلپٹس کے پتے جھوم رہے تھے' سبز اور خوشبودار' جن کے ساتھ میں ہمیشہ سے رہتی آئی تھی' جن سے میں اتنی اچھی طرح واقف تھی' جن کو میں نے بچپنے میں آ کر چھوا بھی تھا اور پیار سے تھپکا بھی تھا' وہ بے جان نہیں تھے۔ اس نے بے یقینی سے نعیم کی طرف دیکھا۔ ''وہ بے جان نہیں تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر انہیں چھوا اور مجھے پرانی دوستی اور اپنائیت کا احساس ہوا وہ زور زور سے ہلنے لگے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کوئی مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتا' میں یہیں رہوں گی' ہمیشہ ہمیشہ...... ہم یہیں رہیں گے نعیم' ایں؟''

''ہاں ہاں۔'' وہ ہنسا۔ ''ہم یہیں رہیں گے' گو میں یوکلپٹس کی بو سے تنگ آ چکا ہوں۔''

ہوا اچانک تیزی سے چلنے لگی اور فوارے کی پھوار سے بچنے کے لیے وہ وہاں سے ہٹ آئے۔ دوسرے لان میں وہ سب شور مچا مچا کر اڑتے ہوئے تاش کے پتوں کو اکٹھا کر رہے تھے۔ دن ختم ہو چکا تھا اور آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔

''آج پھر بارش آئے گی۔'' نعیم نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بارش کے لیے ہمارا کمرہ اچھا نہیں ہے۔''

UrduPhoto.com

''بارشوں سے تنگ آ کر ہی میں نے بدلنے کا ارادہ کیا تھا۔''

دن کی گھٹتی ہوئی روشنی میں سبزے کے کنارے چلتے ہوئے عذرا کی نظر اپنے ہاتھ پر پڑی جس سے وہ نعیم کو سہارا دیے ہوئے تھی۔ اس کے ہاتھ پر بے شمار جھریاں پڑ چکی تھیں اور جلد جگہ جگہ سے اکٹھی ہو کر لٹکنے لگی تھی۔ دفعتاً بے حد خوفزدہ ہو کر اس نے سوچا کہ وہ بوڑھی ہو رہی ہے۔ اس نے مشکوک نظروں سے اپنے خاوند کو دیکھا۔ نعیم کا تندرست ہاتھ اسی طرح مضبوط اور پھولا ہوا تھا۔ اس کا جسم بیمار تھا لیکن اس کی آنکھوں میں جوانی تھی اور بلا کی کشش تھی اور وہ اسی طرح سر اونچا اٹھا کر چلتا تھا۔ اس نے عذرا کی اجنبی نظروں کو محسوس کر کے آہستہ سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ لیکن اس بدبخت لمحے میں عذرا کے دل پر سے ایک بے نام حسد کا سایہ گزر گیا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ نعیم لڑکھڑا کر سنبھلا۔ سہارے کے لیے اس نے دو ایک بار ہوا میں ہاتھ پھیلایا۔ عذرا اس سے الگ دونوں بازو لٹکائے دم بخود کھڑی رہی۔

آخر وہ چھڑی کے سہارے اچھل کر اس کے قریب آیا۔ ''کیا بات ہے عذرا؟''

عذرا نے، جو خوفزدہ نظروں سے اندھیرے میں دیکھ رہی تھی، چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بڑے سے اداس [illegible] چہرے کو دیکھتے ہوئے اسے اس محبوب انسان کی بے پناہ بیکسی کا احساس ہوا۔ ایک بے پناہ ترحم نے اس کے دل کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکی اور رونے لگی۔

''سوچو [illegible] کہا۔

''مت سوچو۔ مت سوچو۔'' نعیم نے جلدی سے اسے بازو میں سمیٹ لیا۔ ''سوچ [illegible] ختم کر دیتی ہے۔ ہم سوچے بغیر بھی رہ سکتے ہیں۔''

پھر وہ ایک ہاتھ اس کا سہارا لیے اور اسے بازو میں سمیٹے چلنے لگا۔ اس کی پیشانی پر ابھی تک تیوری تھی۔

''میں سوچ رہی تھی وہ کس قدر خوش ہو رہے ہیں۔'' دیر کے بعد عذرا نے زہریلے جذبات کا رخ موڑا۔ نعیم نے سر اٹھا کر سامنے والے گروہ کو دیکھا۔ وہ اب ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے اندر کی طرف جا رہے تھے۔

''چلو ہم بھی وہاں چلیں۔'' نعیم نے ہنس کر کہا۔

عذرا نے دہل کر اس کی طرف دیکھا۔ ''نہیں نہیں۔'' اس نے بے خیالی سے سر ہلایا۔ ''وہ اس قدر کمینے ہیں، پرویز اور اس کی بیوی اور اس کا لڑکا اور ممی اور سب۔'' اس نے چیخ کر کہا اور نعیم کی بغل میں منہ چھپا کر سسکی لی۔

''مت سوچو...... مت سوچو۔'' نعیم نے ناراضگی سے دہرایا۔

''تم نہیں سمجھتے، وہ ہمیں اپنے آپ میں سے نہیں جانتے۔ وہ جب تمہیں دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ تم پر ترس کھا رہے ہیں، کہ وہ کسی بات پر پچھتا رہے ہیں۔ وہ ہمیں ناپسند کرتے ہیں۔ تم نے

دیکھا ہے وہ کس قدر احتیاط کے ساتھ' کس قدر اخلاق سے تمہاری خیریت پوچھتے ہیں۔ کیسے کمینے پن کے احساس برتری کے ساتھ غیر معمولی نرمی کے ساتھ' جیسے ان کو سکھایا گیا ہے۔'' اس نے وحشت سے نعیم کی طرف دیکھا۔ ''جیسے ہم سب کو سکھایا گیا تھا۔ چھوٹے موٹے زمیندار' سرکاری اہل کار' منشی' مزارعے۔ 'بابا ہم اس کا گھوڑا بنائیں گے۔' 'نہیں بی بی پہلے ان کو بابا بولو پھر یہ گھوڑا بنیں گے۔' 'ہی ہی ہی رانی بی بی۔' 'آیئے ہم آپ کا گھوڑا بنیں۔' یہ ہماری تربیت تھی۔ وہ اپنی تربیت کو نہیں بھول سکتے۔ میں بھول گئی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ محبت میں آن کر ہماری تربیت کے وہ سارے سال کچھ بھی نہیں رہ جاتے' لیکن وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ وہ محض اپنے اپنے غرور کو سنبھالے زندگی گزار رہے ہیں اور مجھے ان ساری چیزوں کی یاد دلاتے ہیں جو تکلیف دہ ہیں۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ نعیم' میں اپنے گھر میں کیسی جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہوں۔ تمہیں پتا ہے؟'' وہ رو کر بولی۔

''پاگل ہوئی ہو؟'' نعیم نے صرف اتنا کہا۔ ''پاگل ہوئی ہو؟'' اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود کسی لاشعوری خوف کے اثر سے عذرا نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا اور اسے نعیم کے ہاتھ میں چھپانے کی کوشش کی۔ ایک بے وجہ رنج نے اس کی آنکھوں کو دھندلا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ ''میں روؤں گی نہیں' فکر مت کرو۔ میں رو سکتی ہی نہیں' صرف رونے کی نقل کر سکتی ہوں۔ نعیم مجھے خیال ہوتا ہے کہ رو[illegible] چاہیے [illegible] چاہیے اور چپ [illegible] پشیمان شخص محض اذیت سہتا ہے مظلومیت اور خاموشی کے ساتھ۔ بالآخر زندگی میں اس قدر کڑی پشیمانی ہے۔'' اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔ نعیم کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

کھیت کی باڑ کے پیچھے سڑک پر سے خانہ بدوشوں کا ایک کارواں گزر رہا تھا۔ ان کی بیل گاڑیاں اور ان کے اونٹ اور ان کی عورتیں اور مرد سست رفتاری اور آزادی سے اندھیرے میں سفر طے کر رہے تھے۔ کہیں کہیں مدھم لالٹینیں لٹک رہی تھیں۔ ایک نو عمر لڑکا اونٹ کی پشت پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ بارش سے پہلے کی تیز ہوا میں بے فن بانسری کی آواز کبھی دور چلی جاتی کبھی پاس آجاتی اور موسیقی کا اثر پیدا کرتی۔ ''ہوا نے اسے فنکار بنا دیا ہے۔'' بہت سے گڈمڈ خیالات کے درمیان نعیم نے سوچا۔ ''ہوا نے اور آزادی نے۔'' اور اس میں شامل بیلوں کے قدموں کی آواز اور بیل گاڑیوں کے پہیوں کی اور اکا دکا مردوں اور عورتوں کی باتوں کی آواز ہے اور اس میں شامل رات ہے۔'' اس کے ذہن میں وہ مخصوص کنفیوژن تھا جو کسی تیز احساس کا پیش خیمہ ہوتا ہے جس سے پیشتر ہزاروں چھوٹے چھوٹے بے تکے خیالات تیزی سے آتے چلے جاتے ہیں۔ ''رات'' جو ہمارے اور تمہارے درمیان آزادی اور سفر اور ہزیمت لے کر آتی ہے۔ کتنے فاصلے لے کر آتی ہے۔'' اس نے سوچا اور ماتھے پر بارش کے پہلے قطرے محسوس کر کے برآمدے کی طرف مڑا۔ ''تم سورج کی تپش سے بچنے کے لیے رات کو سفر کرتے ہو اور پھر بارش آجاتی ہے۔ خدا حافظ! تمہارا گھر کہاں ہے؟ اب تم اپنے لیے بارش کا ایک گھر بناؤ۔'' اس نے سوچا

UrduPhoto.com

کہ شاید اب وہ ہنسے گا۔ لیکن دراصل وہ بیحد سنجیدہ اور اداس تھا۔ ''یہ کون ہے؟ یہ اندھیرے میں سیڑھیوں پر کون کھڑا ہے؟''

''یہ کون ہے؟'' اس نے بے خیالی سے اونچی آواز میں پوچھا۔

''نجمی۔'' عذرا حقارت سے بولی۔ ''جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔''

برآمدے میں سے گزرتے ہوئے عذرا رک گئی۔ روشن آغا اپنی سٹڈی میں بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان کا چہرہ زرد تھا اور جسم بوڑھا ہو چکا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں وہ بے حس و حرکت کتاب پر جھکے ہوئے تھے۔ ''نعیم، بابا دنیا کے بہترین انسانوں میں سے ہیں۔'' وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے نعیم کو دیکھتی ہوئی بولی۔ ''وہ دنیا کی تمام اچھی باتوں کے اہل ہیں۔ میں صرف ان سے محبت کرتی ہوں۔'' نعیم چل پڑا۔ ''یہ واحد شخص ہے جس سے مجھے نفرت ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ اس نے سوچا۔

اگلے کمرے میں وہ سب بھابی کی میز پر بیٹھے تھے اور نجمی ہاتھ ہلا ہلا کر کوئی بات سنا رہی تھی۔

''اور نجمی بے حد نفیس لڑکی ہے۔'' بید کی آرام کرسی میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔

باہر بارش شروع ہو چکی تھی مگر کمرے میں دن بھر کی گرم ہوا رکی ہوئی تھی۔ جب عذرا نے کھڑکی کھولی تو بارش کی تند اور ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہوئی۔ وہ نعیم کی طرف پیٹھ کیے کھڑکی میں کھڑی رہی۔ نچلی منزل میں ان کے چمچے اور پلیٹوں [illegible] چمچے چلتے رک کر اس نے نعیم کا اور اپنا بستر ٹھیک کیا اور دوائی کی بوتلوں اور گلاسوں کو ترتیب سے رکھا۔ باہر طوفان تیز ہوتا جا رہا تھا۔ بجلی کی کڑک سے [illegible] جب وہ کھڑکی بند کرنے کے لیے بڑھی تو اس نے دیکھا کہ یہ عجیب قسم کا طوفان تھا جس کے ساتھ ہوا کا نام و نشان نہ تھا اور بارش پتھروں کے سے وزنی پن کے ساتھ سیدھی گر رہی تھی۔ اس نے دہل کر کھڑکی بند کر دی۔ بجلی کے خوفناک دھماکے کے ساتھ شیشوں کے لرزنے کی آواز آئی۔ وہ بستر کی چادر کو پھر سے پھیلانے لگی۔

''تم ان کو یہ کام کیوں نہیں کرنے دیتیں۔'' نعیم نے روشن محل کے اتنے سارے نوکروں کے متعلق سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ ہمارے نوکر نہیں ہیں۔'' عذرا نے مختصراً کہا اور سرہانے کو اٹھا کر پھر سے رکھا اور دوائیوں والی میز کو کھسکایا اور قالین کے کونے کو پاؤں سے پہلے الٹا پھر سیدھا کیا اور تھک کر نعیم کو دیکھا اور دیکھتی رہی۔ اس طویل، سست رفتار لمحے میں اس کی پریشانی خفیف سی ندامت میں تبدیل ہو گئی۔

''یعنی ہم تو چلے ہی جائیں گے۔ ان سے ہمارا تعلق کیا۔ کیوں؟'' اس نے کہا۔ اس کوشش میں ناکام رہ کر وہ پھر پریشان ہو گئی اور پہلے سے زیادہ بے تکے پن کے ساتھ کمرے میں پھرنے لگی۔

''ہم کب جائیں گے۔ اگلے مہینے؟ شاید تم ٹھیک ہو جاؤ۔'' اس نے اعصابی لہجے میں جلد جلد کہا۔

اب وہ سب آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے اوپر آ رہے تھے۔ بادل کی گرج کے ساتھ ان کی آواز دب جاتی اور پھر آنے لگتی۔ وہ پرسکون اور مسرور گھریلو انسانوں کی آوازیں تھیں جو زندگی سے مکمل طور پر مطمئن اور محظوظ تھے۔ انہیں طوفانی رات کی کوئی خبر نہ تھی۔ ان کی بات چیت میں گہری بے تکلف اپنائیت تھی جو قطعی طور پر رچے بچے ہوئے مانوس گھریلو تعلقات سے پیدا ہوتی ہے۔ ان میں کوئی "کھچاؤ" کوئی رکھ رکھاؤ نہ تھا۔ بجلی کی کڑک کے ساتھ ساتھ وہ ہنس رہے تھے۔ دفعتاً نعیم کو اپنے اور عذرا کے غیر فطری "تکلیف دہ تعلق" کا احساس ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ ان دونوں کے آس پاس ایک بے نام' بے حد خون رینگ رہا تھا جس نے ان کی زندگیوں کو کمزور اور ناتواں بنا دیا تھا' کہ وہ دو ایک دوسرے سے الگ' تنہا اور بے حقیقت وجود تھے جو ایک مکمل صحت مند جسم سے ٹوٹ کر جدا ہو چکے تھے اور آہستہ آہستہ مر رہے تھے دنیا کی تمام برائیوں کو ایک ایک کر کے جمع کر رہے تھے۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"کھڑکی کھول دو۔" اس نے بھاری خشک گلے سے کہا۔

عذرا وہیں کھڑکی کے شیشوں پر مسلسل چمکتی ہوئی بجلی کو دیکھتی رہی۔ نعیم نے اسے تیز چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا جنہیں ترحم اور بے بسی نے آہستہ آہستہ نرم بنا دیا۔ گیلری میں سے ہنسنے کی آواز آئی۔ یہ لاپروا بے تکلف ہنسی تھی جس میں آوارگی اور ساری دنیا کے لیے حقارت کا تاثر تھا۔ ایک قابل نفرت ہنسی تھی

"[illegible]"

UrduPhoto.com

پروفیسر اور اس کی بیوی کی آواز آہستہ آہستہ دور چلی گئی۔ وہ ابھی تک ہنس رہے تھے۔ بجلی نے رات کا ننھا سا بلب کمرے میں جلتا ہوا دیکھا اور دبے پاؤں دروازے کے آگے سے گزر گئی۔

"آؤ...... یہاں آؤ۔" نعیم نے تیزی سے کہا۔ عذرا نے دیکھا کہ وہ بے حد گھبرا گیا ہے۔ وہ جا کر کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ نعیم نے اس کی کمر کے گرد بازو ڈال کر اپنی طرف کھینچا۔

"تم ٹھیک ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کیا' کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" نعیم نے لمبا سانس لے کر دوسری طرف دیکھا۔ "میں نے سوچا شاید تم اس سے خوفزدہ ہو۔"

"خوفزدہ ...." عذرا پھنکاری۔ "اس سے۔ اس سے......"

"نہیں عذرا ...... عذرا۔" وہ اس کی چھاتی پر سر گرا کر پکارا۔ "تم بس یہاں بیٹھی رہو۔ خاموش۔ کچھ مت کہو' کچھ مت سوچو۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ خوشی سے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں کمزور محسوس کر رہا ہوں' یہاں۔" اس نے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

"نعیم ہاں میں یہاں بیٹھی ہوں۔" عذرا نے پریشان ہو کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "میں خاموشی سے

بیٹھی ہوں۔ ہم یہاں سے چلے۔''

''اوہ نہیں نہیں۔'' نعیم نے اس کی کمر سے ہاتھ نکال کر ماتھے پر رکھ لیا۔ ''نہیں نہیں۔ تم نہیں سمجھتیں۔ تم خاموش رہو۔ ہم نہیں رہیں گے۔ وہ ہمارے دوست ہیں' رشتہ دار ہیں' ہمدرد ہیں۔ میں مرنا نہیں چاہتا' کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں سرکاری ملازمت کرلوں گا یا جو تم کہو گی کروں گا۔ جو روشن آغا کہیں گے کروں گا۔ یہ ہمارا گھر ہے۔ میں تنگ آچکا ہوں۔''

عذرا گھبرا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اس پریشانی کی دھند میں سے باہر نکل آئی۔ اس نے کئی بار دل میں نعیم کے الفاظ دہرائے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار نعیم کے منہ سے موافقت کی باتیں سن کر وہ بھونچکی رہ گئی کیونکہ وہ خود نعیم کے ساتھ چلنے کی کوشش میں ان خیالات کو دفن کر چکی تھی' بھول چکی تھی' معاف کر چکی تھی' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے' کیا کرے۔

''اچھا...... اچھا؟'' نعیم کے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے زیر لب دہرایا۔ برسوں کی مدفون' زنگ آلود خواہشات زندہ ہو رہی تھیں اور نعیم کے الفاظ اس کے ذہن میں شور مچا رہے تھے۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی کہ اب وہ کیا کرنے والی ہے' قہقہہ لگا کر ہنسنے والی ہے یا چیخ چیخ کر رونے والی ہے۔ وہ دونوں باتیں ایک ہی آسانی اور خوشی کے ساتھ کر سکتی تھی۔ لیکن جذبات کے تھپلکے میں اس نے یہ بھی سوچا کہ ان باتوں کے لیے اب وہ بوڑھی ہو چکی تھی۔ کہیں [illegible] کے خوابوں اور خواہشوں کے جزیرے میں موسم بے حد چمکدار اور خاموش اور سمندر پرسکون تھا۔ اس نے کچھ بھی نہ کیا' محض نعیم کو کھو دینے کے ڈر سے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے بیٹھی رہی۔ جس تیزی کے ساتھ اس کے نقطۂ نظر میں تبدیلی واقع ہوئی وہ حیرت انگیز تھی۔

''میں نے تمہارے لیے کیا کیا ہے۔ تمہیں اپنے بہن بھائیوں کا' ماں باپ کا' سارے گھر کا دشمن بنا دیا ہے۔ اوہ۔'' اس نے عذرا کا ہاتھ مضبوطی اور رنج سے دبایا۔ ''میں نے تمہارے دل میں نفرت اور خوف کا بیج بویا ہے۔ میں نے تمہیں ذلیل کیا ہے' سب کے سامنے۔ میں نے تمہیں ایک ہزیمت خوردہ زندگی دی ہے۔ تم ایک عظیم عورت ہو۔ میں نے تمہیں تباہ کر دیا ہے' محبت کے بدلے میں' اب خود تباہ ہو رہا ہوں۔ میں کیا کر سکتا ہوں' تم نے کہا تھا بالآخر زندگی میں اس قدر کڑی پشیمانی ہے۔ عذرا میں تنگ آچکا ہوں۔ میں باہر جانا چاہتا ہوں' کام کرنا چاہتا ہوں' کوئی بھی' کچھ بھی' کیا فرق پڑتا ہے جب میں مر رہا ہوں۔ میں اب لیٹ نہیں سکتا۔ اوہ۔'' اس نے اپنا گلا بند ہوتا ہوا محسوس کیا۔ وہ زور سے کھانسا اور دیر تک کھانستا رہا۔ پرانے ناتواں مریض کی طرح اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ ''عذرا' ڈاکٹر کو مت آنے دو۔ میں اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا۔ میں اور نہیں لیٹ سکتا۔'' ''قریب آؤ...... میں کمزور...... اوہ...... عذرا میں رونا نہیں چاہتا......''

بالآخر کچھ بھی نہ کر سکا اور برسوں کی جسمانی اور روحانی اذیت سے ٹوٹ کر رونے لگا' ایک مغرور اور

UrduPhoto.com

لاچار بڈھے کی طرح جو رو نہیں سکتا لیکن زندگی کی انتہائی بے بسی پر پہنچ کر آنسو بھونڈے پن سے بند ہوتے ہوئے حلق میں سے نکلتی ہوئی مختصر جھٹکے دار آواز کے ہمراہ آنے لگتے ہیں اور چہرے کی ہیئت انتہائی مسخرے پن کا نمونہ پیش کرتی ہے جسے دیکھ کر چھوٹی عمر کے نادان لوگ ہنسنے لگتے ہیں۔

عذرا نے اطمینان کے ساتھ اسے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ دیر کے بعد جب نعیم اشتہا کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا وہ آہستہ سے مسکرائی۔ اس رات وہ لپٹ کر اس کے ساتھ سوئی رہی اور اپنی گرم خشک ہتھیلیاں اس کے نیم مردہ جسم پر پھیرتی رہی اور باہر کے طوفان سے اتنی ہی بے خبر رہی جتنے کہ دوسرے لوگ' حالانکہ وہ بے حد طوفانی رات تھی۔

☆......☆......☆

UrduPhoto.com

(۳)

بٹوارہ

واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون (۱۱)

(جب ان سے کہا گیا کہ زمین پر فساد مت پھیلاؤ تو وہ کہنے لگے کہ ہم ایمان والوں میں سے ہیں)

☆......☆......☆

UrduPhoto.com

(۳۸)

منا لال سیمنٹ فیکٹری میں دوپہر کا گھنٹہ ہوا تو وہ سب کھانے کی پوٹلیاں کھول کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ ان کو ایک جگہ پر جمع ہو کر کھانے کی اجازت نہ تھی کیونکہ فیکٹری چوبیس گھنٹے چلتی تھی اور مزدور اور کاریگر آٹھ آٹھ گھنٹے کی تین شفٹوں میں کام کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو آٹھ گھنٹے مسلسل کام کرنا پڑتا تھا۔ جہاں تک کھانے کا تعلق تھا قانون میں کوئی ایسی شق نہ تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ یہ لوگ کھانے کی عادت بھی رکھتے تھے۔ یہ 'فیکٹری ایکٹ' تھا جس کے بنانے والے' کر جاتے تھے کہ مشینری کے بغیر دنیا بھر کے آدمی مل کر بھی سیمنٹ نہیں بنا سکتے' مشینری کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے [illegible] آدھ مرتبہ کھانے کا ذکر آنے پر ایک طرف سے مذاق کہا گیا کہ ہر قسم کے کھانے کا ذکر ہماری مذہبی اور آسمانی کتابوں میں بہت پہلے ہی آچکا ہے البتہ سیمنٹ کی اہمیت کو وہاں پر خوفناک حد تک نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

چنانچہ 'فیکٹری ایکٹ' میں کھانے کا عدم ذکر!

لیکن کھانے پر چونکہ عام لوگوں کی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے اس لئے جب افسران کے لئے دوپہر کے وقفے کا گھنٹہ بجتا تو وہ لوگ بھی مشینوں پر نظر رکھے ہوئے' اپنے اپنے کام پر چوکس بیٹھے جلدی جلدی کھانا کھا لیا کرتے اور ان کے فورمین' کہ خود بھی کھانا کھاتے تھے' ان کی ان چھوٹی موٹی کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیا کرتے۔ وہ سب اپنا کھانا ساتھ لے کر آتے اور کام پر پہنچ کر اپنی اپنی پوٹلیوں کو تختوں پر یا مشینوں کے غیر متحرک پرزوں پر رکھ دیتے۔ اس طرح کھانے کے وقفے تک وہ پوٹلی مشین کا ایک ساکن حصہ بن جاتی لیکن اس کے اندر کوئی پرزہ' دوسرے پوشیدہ پرزوں کی طرح' مستقل چلتا رہتا اور اپنے اندر کوئی پرزہ' دوسرے پوشیدہ پرزوں کی طرح' مستقل چلتا رہتا اور اپنے ساتھ ایک انسان کو بھی مستقل چلائے رکھتا۔ کھانے کے بعد وہ اس چھوٹے سے کپڑے کو جھاڑتے' اس میں رچی ہوئی پرانی' سیاہ چکنائی سے اپنے خشک چہروں اور گردنوں کو چکنا کرتے اور کس کر سروں پر باندھ لیتے۔ پھر وہ دیوار کے سہارے بیٹھ کر ایک ایک سگریٹ پیتے اور مشینری کی بھاری' غنود آور' مستقل تال کے نیچے جاگتے رہنے کی کوشش کرتے ہوئے چھٹی کے وقت کا انتظار کرتے رہتے۔ دوسرے پرزوں سے انہیں کبھی بھی دلچسپی

نہ ہوئی تھی۔

اس کے باوجود کبھی کبھی وہ اپنی جگہ سے کھسکنے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس سلسلے میں رفع حاجت کا بہانہ سب سے زیادہ کامیاب رہتا۔ کبھی کبھی تو وہ دن میں کئی کئی بار بیماری کا بہانہ کر کے جاتے اور غلمن کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی ٹٹیوں میں دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر سگریٹ پیتے' اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے اور اکیلے ہوتے تو دیوار پر فورمین کے خلاف بری بری باتیں لکھتے اور نفرت سے لب بھینچ کر مسکراتے۔ پھر سگریٹ کو غلاظت میں پھینک کر انتہائی سست رفتاری کے ساتھ واپس اپنی جگہ تک آتے۔ ایسے میں اگر کوئی فورمین انہیں دیکھ لیتا تو گالیوں سے بھرپور زبان میں انہیں کام پر پہنچنے کی تلقین کرتا۔ جواب میں وہ ڈھٹائی سے ہنستے اور زیر لب گالیاں بڑبڑاتے ہوئے چال کو ہلکا سا تیز کر دیتے۔ مشینری نے انہیں بالکل نکما کر دیا تھا۔

باتیں کرنے کا انہیں یوں بھی موقع کم ہی ملتا۔ مشینوں کا شور اتنا زیادہ تھا کہ جب کبھی وہ خاموش بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے تو ساتھ والے سے بات کرنے کے لئے انہیں پوری آواز سے چیختا پڑتا۔ چنانچہ دو ایک باتوں میں ہی ان کے گلے کی تسکین ہو جاتی۔ وہ ان گونگے' کند ذہن اور سدا تھکے ماندے گدھوں کی طرح تھے جنہیں چلانے کے لئے قدم قدم پر ڈنڈے مارنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

وہ [illegible] کا ایک بے حد گرم دن تھا اور باہر لو چل رہی تھی۔ اندر وہ اپنی اپنی پوٹلیاں کھولے کھانے میں مصروف تھے۔ [illegible] اس کی بیوی بیمار رہتے رہتے اب چارپائی سے جا لگی تھی اور وہ دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتا تھا۔ کبھی کبھی خوش قسمتی سے اس کی آنکھ ذرا سویرے کھل جاتی تو وہ جلد جلد روٹی پکا کر کھا لیتا۔ لیکن وہ شروع شروع کی بات تھی۔ اب وہ اس سارے جھمیلے سے اتنا بیزار اور لاپرواہ ہو چکا تھا کہ سونے جاگنے' کھانے پینے اور کام پر جانے سے بہت کم دلچسپی اس کو رہ گئی تھی اور وہ بھوکا رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ خاموشی سے بستر پر پڑا عائشہ کی گہری سانسوں' منہ اندھیرے کے پرندوں اور صبح سویرے کی خواب آلود آوازوں کو سنتا رہتا۔ پھر وقت مقررہ پر اٹھ کر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتا' چند گھونٹ پیتا اور عائشہ پر ایک آخری نظر ڈال کر کام پر چلا جاتا۔ شام کو آ کر آگ جلاتا اور پانی میں سبزیاں ابالتا' گیہوں یا مکئی کی موٹی موٹی روٹیاں پکاتا اور پہلے عائشہ کو کھلاتا' پھر خود کھاتا۔ عائشہ زیادہ تر ابلی ہوئی سبزی کھاتی۔ کبھی کبھار وہ چاول اور گوشت بھی کھاتے۔ خاموشی سے کھانا کھا کر وہ اپنی اپنی جگہ پر لیٹ جاتے اور تھوڑی دیر کے بعد آوارہ بلیاں آ کر جھوٹے برتن چاٹنے لگتیں۔ باتیں کرنے کی ہفتوں نوبت نہ آتی۔

ہر تین ماہ کے بعد جب اس کے پاس کچھ پیسے جمع ہو جاتے تو وہ ڈاکٹر کو لے کر آتا جو اس کی بیوی کے لئے کئی قسم کی دوائیاں تجویز کر کے چلا جاتا۔ ان میں جتنی وہ خرید کر لا سکتا لے آتا اور باقاعدگی سے عائشہ کو پلانے لگتا۔ صرف ایک باقاعدگی اور ایک قانون جو اس کی زندگی میں رہ گیا تھا عائشہ کی دوا کا تھا۔ جتنا وقت وہ اس کے پاس رہتا ایک ڈاکٹر کی سی سختی کے ساتھ وقت پر دوا پلاتا رہتا' بغیر کسی جذبے کے' جیسے مشین کو تیل دیتے ہیں۔ بیوی

کے ساتھ اس کی وفاداری' بھوکے پیٹ کام کرنے کی اہلیت اور دوسرے دنیاوی کاموں سے اس کے استغنا کو دیکھ کر اس کے ساتھی اسے ''علی سائیں'' یا محض ''سائیں'' کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

اس کے باوجود یہ دوپہر کا وقت اس کے لئے مشکل ترین ہوتا۔ پہلے پہل اس کا کوئی نہ کوئی ساتھی اسے کھانے کی دعوت دے دیتا اور وہ کچھ نہ کچھ کھا لیا کرتا' لیکن کوئی کسی کو کب تک کھلا سکتا تھا۔ اب اس کو کوئی بھی نہ پوچھتا۔ سب جانتے تھے کہ یہ اس کا معمول ہو چکا تھا اور اس کے علاوہ ان میں سے ہر ایک اپنے دل میں مطمئن تھا کہ اپنی دوستی کی حد تک وہ کافی عرصے تک اس کو کھلا چکا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ علی سخت بھوک محسوس کیا کرتا بلکہ اس کے برعکس اس کی کھانے کی خواہش ہی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی' لیکن وہ محسوس کرتا تھا کہ دوپہر کے وقت جب وہ سب اپنے اپنے کھانے کی جانب دیکھتے جاتے تھے (گو اس میں زیادہ تر اس کا تصور شامل تھا)۔ اس سارے دوران میں وہ خالی خالی نظریں مشین پر جمائے بیٹھا رہتا تھا۔

صرف ایک بخش تھا جو باقاعدگی کے ساتھ دوستی نبھائے جا رہا تھا۔ وہ بے حد خوش مزاج نوجوان آدمی تھا جو ابھی کام سیکھ رہا تھا اور اپنی ماں کے ساتھ اکیلا ایک کوٹھری میں رہتا تھا۔ اس کی ماں ہاتھ والی کپڑے کی مل میں کام کرتی تھی۔ کسی نے کبھی اس کو غمگین نہ دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ ہنستا اور چہچہاتا رہتا۔ اپنے ساتھیوں میں وہ ''کماری'' کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے بازو پر اس نے ایک حسین عورت کی شبیہ گدوا رکھی تھی اور جب وہ اپنی کلائی اور [illegible] حرکت [illegible] والی [illegible] ہوئی عورت ناچتی ہوئی نظر آنے لگتی۔ ہر پہلے آدمی کی خواہش پر وہ اسے نچانے لگتا کیونکہ اس پر اس کا کچھ بھی خرچ نہ ہوتا تھا۔ صرف اپنی ماں کے سامنے وہ کبھی بازو ننگا نہ کیا کرتا۔

وہ بارہ مہینے جو کی روٹی لے کر آتا جس کو وہ کچے بیروں کے ساتھ جنہیں وہ راستے میں اگی ہوئی جنگلی بیریوں سے پتھر مار مار کر گراتا' کھایا کرتا۔ بیروں کی خاطر اس کو منہ اندھیرے گھر سے چلنا پڑتا تھا۔ کسی نے اس کو کبھی کچھ اور کھاتے ہوئے نہ دیکھا تھا حالانکہ اس کا کہنا تھا کہ دیوالی کے موقع پر گھر میں وہ چاول اور گوشت اور گیہوں کی روٹی کھایا کرتے تھے۔ وہ باقاعدگی سے ہر دوسرے تیسرے دن علی کو بیر دیا کرتا اور کبھی کبھار روٹی کا ایک ٹکڑا بھی دے دیتا۔ علی بغیر شکریہ ادا کئے اس سے کھانے کی چیزیں قبول کر لیا کرتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بخش اپنی ضرورت سے زیادہ بیر لے کر آتا تھا اور روٹی وہ اس کو صرف اسی حالت میں دیتا جب کہ وہ خود سیر ہو چکتا۔ لیکن یہ وضع داری اور دوستی سب دیکھنے والوں کی باتیں تھیں۔ ان دونوں کے درمیان ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ ان دو گنوار بھائیوں کی طرح تھے جو ایک مدت تک ساتھ ساتھ رہنے کے بعد اس عمر کو پہنچ جاتے ہیں جب ان میں بغیر شکریہ کے ایک دوسرے کا احسان اٹھانے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے اور جن کو ایک دوسرے کی خوشی سے بظاہر کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یا پھر ان دو بوڑھے جانوروں کی طرح جو ایک جنگل میں تنہا رہتے ہیں اور جن کے دل میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی' ترحم اور غیر شعوری رفاقت کے جذبے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جو ایک دوسرے کی کمی کو محسوس بھی

''اس وقت اللہ گواہ ہے کہ میں نے گنجے کو ایک طرف لے جا کر کان میں کہا کہ یہ گانٹھ جو وہ دے رہا ہے پکی نہیں ہے۔ ایک ٹن سے زیادہ وزن کے لئے یہ گانٹھ کام دے ہی نہیں سکتی۔ پر اس نے اس کان سے سنا اس سے اڑا دیا' اور تڑاخ...... سب نے تو دیکھا ہی کہ کیا ہوا۔ اب؟''

''اس کی بھی ٹانگ توڑ دینی چاہیے۔'' کسی نے تجویز کیا۔ سب ہنسنے لگے۔

''سور'' ہیڈ فٹر غرایا۔ ''اس کو جیل میں پھینکا جا سکتا تھا۔ لیکن افسر؟ جس کو چاہیں بچا لیں' جس کو چاہیں بھوکا مار دیں۔ کون سنتا ہے۔''

'الیکٹرک شاپ' سے چند الیکٹریشن نکل کر آ کھڑے ہوئے اور سگریٹ پینے لگے۔ اب ہیڈ فٹر اپنا اور گنجے فورمین کا مقابلہ کر رہا تھا اور کام میں اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فورمین کے خلاف تو سب خوشی سے سنتے رہے لیکن اب ان کی دلچسپی ختم ہو گئی کیونکہ ان میں زیادہ تر کاریگر تھے اور ہیڈ فٹر کی برتری ماننے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ سب آپس میں باتیں کرنے لگے جس سے ہیڈ فٹر مشتعل ہو گیا اور چلا چلا کر بولنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اگر کوئی وہاں سے گزرتا تو دیکھتا کہ مقرر اور سامعین میں گلا پھاڑنے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ جلد ہی دوپہر کے وقفے کے خاتمے کا بھونپو بجا اور وہ وہاں سے تتر بتر ہونے لگے۔ علی کو جاتے ہوئے دیکھ کر ہیڈ فٹر نے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''[illegible] میں)۔''

''جی نہیں۔'' علی نے کندھے اچکا کر کہا اور باہر نکل آیا۔ باہر ابھی تک لو چل رہی تھی۔

اس نے اس مہیب عمارت پر' جہاں وہ کام کرتا تھا' ایک نظر ڈالی اور دوسری طرف چل پڑا۔ ایک اور کھلی جگہ پار کرنے کے بعد وہ 'موٹر شاپ' میں نکل آیا۔ وہاں پر چند مکینک ایک ٹرک کے کھلے ہوئے انجن پر جھکے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے گریس اور تیل لگے چہروں پر سے سیاہ پسینے کے قطرے انجن میں ٹپک رہے تھے اور وہ بلاوجہ انجن میں ہاتھ مار رہے تھے۔ دو فٹر انجن کے نیچے سیدھے لیٹے کام کر رہے تھے اور اوپر والوں سے باتیں کر رہے تھے۔ مشین ان کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ ڈال رہی تھی۔ اوپر والوں نے خاموشی سے سر اٹھا کر علی کو دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ لوگ جو محض اس انجن کی وجہ سے وہاں پر موجود تھے' دراصل اس سے اس قدر مختلف تھے کہ ان کو اس سرد' بد صورت بگڑی ہوئی مشین سے کوئی سروکار نہ تھا اور وہ ایک دوسرے کے لئے بے حقیقت تھے اور اس کے باوجود وہ محض اس مشین کی خاطر جمع تھے۔ اپنے خیال کے بے تکے پن پر وہ دل میں ہنسا اور تھکی ہوئی' کڑی' مستقل چال سے وہاں سے گزر گیا۔ آگے ریل کی پٹڑیاں تھیں جن پر مال گاڑی کے چند خالی ڈبے ادھر ادھر کھڑے تھے۔ ایک ڈبے کے سائے میں رک کر چند منٹ تک اس پر انگلیاں بجانے کے بعد وہ آگے چل پڑا۔ ''لوڈنگ پلیٹ فارم'' پر لمبی مال گاڑی کھڑی تھی اور اس میں چیختے چلاتے ہوئے مزدور بوریاں لاد رہے تھے۔ اس کے پیچھے بوریاں بھرنے کی مشینوں کی عمارت تھی اور سیمنٹ کے اونچے اونچے گودام تھے۔ ساری عمارت اور پلیٹ فارم سیمنٹ کی دھواں

دھار گرد میں لپٹے ہوئے تھے جو گرمی میں اضافہ کر رہی تھی۔ عمارت کے عقب میں علی کے دو ہمسائے بجلی کی زمین دوز لائن کی مرمت کرنے کی خاطر کھدائی کر رہے تھے۔ جب علی ان کے پاس رکا تو وہ کمر تک گہرے تازہ کھدے ہوئے گڑھے میں کھڑے کہنیاں زمین پر ٹکائے ایک دوسرے کی کلائی موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک زور لگانے کے بعد انھوں نے ہاتھ چھوڑ دیے۔ یونس علی کو دیکھ کر ہنسا:

''کہتا ہے چھوٹے سر والے مرد کو عورتیں زیادہ پسند نہیں کرتیں۔ اس میں مردی کم ہوتی ہے۔ میں نے کہا آ و تمھیں مردی دکھاؤں۔ مردوں کے یہ طریقے ہیں۔'' اس نے پنجہ پھیلایا۔ ''تمہارے سر پر تو دو من بال اور دو من پگڑی ہے اور جوئیں الگ...'' اس نے کرم سنگھ کی پگڑی میں انگلی چبھوتے ہوئے کہا۔ علی منہ کھول کر ہنسا اور آگے چل پڑا۔ ذرا دور پر چند بجلی والے سائے میں بیٹھے کھدائی ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ آگے کوئلے کا گودام تھا جہاں کوئلہ مال گاڑیوں پر سے اتارا جا رہا تھا۔ سیاہ کالے مزدور اور گدھے کوئلہ ڈھو رہے تھے۔ علی نے ایک نوعمر لڑکے کو دیکھا جو ایک موٹی سی سوٹی لیے کھڑا تھا اور ساتھ ساتھ گدھے کو ہانک رہا تھا۔ ہر چند قدم پر جب اس کا گدھا رک جاتا تو وہ ایک ہاتھ سے اس کی پونچھ اٹھاتا اور سوٹی منہ سے نکال کر اس کی دم کے نیچے گھسیڑ دیتا۔ گدھا اچھل کر چلنے لگتا۔ آگے وہ نالی تھی جس کے ذریعے فیکٹری کا فالتو پانی باہر جاتا تھا۔ نالی کے کنارے کنارے کوئلہ ڈھونے والے وہ مزدور، جنھوں نے ابھی ابھی چھٹی کی تھی، ننگ دھڑنگ نہا رہے تھے۔ ان کے جسم کوئلے کی [illegible] ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ [illegible] ہو کر پیشاب کر رہے تھے اور [illegible] بے شرمی سے بڑے بڑے بالوں میں انگلیاں ڈالے کھجا رہے تھے۔ علی نے ہوا میں گالی دی اور نظر بچا کر وہاں سے گزر گیا۔

(۳۹)

چار بجے جب دن والی شفٹ ختم ہوئی تو سب مزدور کام چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ اگلی شفٹ والوں کو دروازے پر ہی روک لیا گیا۔ مشینیں بہرحال چلتی رہیں، فورمینوں اور سپروائزروں کے سہارے جنھوں نے بھاگ دوڑ کر کام سنبھال لیا تھا۔ یا چند ایک مزدور تھے جو فوڈی بن کر منتظمین کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئے تھے۔

گیٹ کے باہر لکڑی کے دو کریٹوں پر چڑھ کر یونین کے پریذیڈنٹ نے جو شہر کا ایک معمولی وکیل تھا، تقریر شروع کی:

''محنت کشو! آخر وہ وقت آن پہنچا ہے جب اپنی محنتوں کا پورا پورا صلہ حاصل کرنے کے لیے تمھیں قربانی دینی ہوگی۔ آج تمہاری اپنی محنت، تمہاری مشقت تمہارا خون مانگتی ہے۔ آج تک تم نے اپنی محنت کو اپنا پسینہ دیا ہے۔ آج تک تمہارے پنڈوں سے نچڑے ہوئے ہزاروں قطرے اس زمین میں جذب ہوتے رہے ہیں۔ آج اگر یہ زمین

بول سکتی تو تمہارے نام پر اور تمہاری محنت کی سیرابی پر آفرین بھیجتی' لیکن محنت کے ان سارے سالوں میں نہ زمین بولی اور نہ ہمارے مالک سیراب ہوئے' اور اس کے باوجود یہ مہیب عمارتیں اور یہ بھاری مشینری ہزاروں مزدوروں اور ہزاروں گدھوں نے دیکھتے دیکھتے کھڑی کر دی۔ مزدوروں اور گدھوں کا پسینہ ایک جگہ گرا اور ہمارے مالکوں نے سمجھا کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور آج تک یہی سمجھتے آ رہے ہیں۔ آج تک' میرے مزدور ہموطنو! اس زمین کی طرح جس میں تم رہتے ہو' جس میں تم سوتے جاگتے اور کام کرتے ہو' جس کی مٹی سے تم اٹھے ہو اور جس کی خوشبو سے تم اتنی اچھی طرح واقف ہو' آج تک اس زمین کی طرح تم بے زبان اور مصیبت زدہ رہے ہو اور اپنے بہترین ساتھی گدھے کی طرح بدحال رہے اور اس کے باوجود تم نے بڑے بڑے کام کئے۔ تم نے ہزاروں من وزنی لوہے کی مشینری کہاں سے کہاں پہنچا دی اور ایک نیا شہر آباد کیا۔ ادھر سے تم نے خشک بیکار پتھر ڈالے اور اُدھر سے سیمنٹ نکالا۔ تم نے بنجر' بے پھل پتھر میں سے سونا پیدا کیا۔ پھر......" وہ رخ پھیر کر دوسرے گروہ سے مخاطب ہوا۔

"تم نے ادھر سے محنت کش کسانوں کی اگائی ہوئی کپاس ڈالی اور ادھر سے کپڑا نکالا۔ وہ خوبصورت ملائم اور مضبوط کپڑا جس نے منڈیوں میں بھرمار لگا دی ہے' جس نے مالکوں کے جسموں کو خوشنما بنا دیا ہے اور تمہارے بچے آج تک گلیوں میں ننگے پھرتے ہیں اور تمہاری بیویوں نے برسوں سے نیا لباس نہیں دیکھا۔ کیا تمہارے بغیر یہ سب کچھ کیا جا سکتا تھا؟ کیا اپنی ساری دولت کے باوجود وہ کپاس کے ایک تار کو بھی کپڑے میں تبدیل کر سکتے تھے؟ اگر کپاس کے ایک ڈھیر کو رو [illegible] بنتا۔"

مجمع میں سے کوئی ہنسا جس پر مقرر نے غضبناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم کہاں سے آئے ہو؟ اپنی زمینیں اور مکان اور مویشی چھوڑ کر یہاں جمع ہوئے ہو' تم نے اپنے پسینے' اپنی مشقت اور اپنی کاریگری کی بنا پر ایک دوسرے کو جانا اور ایک دوسرے کے درد کو پہچانا ہے۔ کس لئے؟ اس لئے کہ تمہارے ساتھ اور تمہارے باربردار جانوروں کے ساتھ ایک سا سلوک کیا جائے؟ نہیں۔ آج وہ لازوال وقت آ گیا ہے جب برسوں کی اندھی اور گونگی محنت کے بعد بالآخر تم نے محسوس کیا ہے کہ تم انسان ہو' کہ تم زمین پر بسنے والی ساری جاندار مخلوق میں سے برتر ہو' کہ تم بہتر سلوک کے مستحق ہو' تم سوچتے اور سمجھتے ہو' تمہیں گیہوں اور چنے کی روٹی کا فرق معلوم ہے' تمہارے جسم نرم اور سخت کپڑے کو الگ الگ محسوس کرتے ہیں' کہ تمہاری آنکھیں صفائی اور گندگی میں تمیز کرنے کی اہل ہیں' کہ تم خوشبوؤں اور خوبصورت چیزوں کو پسند کرتے ہو' کہ تم میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جو تمہیں جانوروں سے الگ اور افضل بناتی ہیں۔ لیکن اس قدیم حقیقت اور نئی آگاہی کو ان تک پہنچانے کے لئے تمہارے خون کی ضرورت ہے کیونکہ اب تمہارا پسینہ ختم ہو چکا ہے' ان مردہ انسانی روحوں کو حرکت میں لانے کے لئے تمہارا خون درکار ہے اور جب یہ بھی ختم ہو گیا تو تمہاری ہڈیوں پر اس آگاہی کو قائم رکھا جائے گا۔"

مزدوروں کے مجمع میں سے بلبلاہٹ اٹھی جو آہستہ آہستہ نعروں میں تبدیل ہو گئی۔ پھر انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی قومی اور مذہبی قسم کے نعرے لگائے جن کا موضوع سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس موقع پر کپڑے کی مل سے

UrduPhoto.com

عورتوں کا جلوس آ کر ان کے قریب رک گیا۔ یہ سب مزدور عورتیں تھیں جو کپاس سے بنولہ الگ کرنے کا کام کرتی تھیں۔ ان کی رہنمائی ایک گندمی رنگ کی ڈھلتی ہوئی عمر والی عورت کر رہی تھی جو نزدیک سے دیکھنے پر تقریباً خوبصورت نظر آتی تھی۔ انہوں نے سوٹیوں پر رنگ برنگے کپڑوں کے ٹکڑے ٹانگ کر جھنڈے بنا رکھے تھے جن سے کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا۔ جب وہ نعرے لگاتی لگاتی ان کے قریب آ کر رک گئیں تو مزدوروں میں نمایاں طور پر جوش پھیلنے لگا۔ ایک چھوٹا سا کمزور مزدور، جس کو کم لوگ فیکٹری میں جانتے تھے، چھلانگ لگا کر کریٹ پر چڑھا۔ پریذیڈنٹ کچھ دیر تک سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا پھر نیچے کود گیا۔ لوگوں نے اس نوجوان کے کمزور جسم میں سے نکلتی ہوئی طاقتور آواز کو حیرت سے سنا۔

''بھائیو! ہم غریب اور ان پڑھ لوگ ہیں لیکن ہم کام کرتے ہیں اور حق حلال کی روزی کماتے ہیں۔ ہم میں سے زیادہ تر کند ذہن بھی ہوں گے لیکن ہم کاہل اور بے وجود نہیں ہیں۔ پچھلے برس ہم نے پانچ لاکھ گز کپڑا بنایا ہے' کیا ہمیں ایک کی بجائے دو ڈانگریاں نہیں دی جا سکتیں؟ اب جاتے ہیں کہ چھ ماہ میں ایک ڈانگری کا تار تار الگ ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دولت کے ساتھ عقل بھی آ جاتی ہے' کیا وہ نہیں جانتے کہ چھ مہینے میں ڈانگری کا پھٹ جانا ہماری محنت کی نشانی ہے۔ اگر ہم کام نہ کریں تو یہ دو برس تک بھی چل سکتی ہے۔ وہ ہمارے ننگے جسموں کو کیوں ناپسند نہیں کرتے؟ وہ لوگ جو خوبصورت گھروں میں رہتے ہیں اور خوبصورت تصویریں دیواروں پر لگاتے ہیں' ہمارے سیاہ [illegible] بنایا ہے جس سے کمپنی کو دس لاکھ روپے کا فائدہ ہوا ہے' کیا ہماری مزدوری آٹھ آنے روز کے حساب سے بھی نہیں بڑھائی جا سکتی؟ ہم لاکھوں کما کر دیتے اور صرف سینکڑوں میں اپنا حق مانگتے ہیں۔ ہمیں رہنے کے لئے مکان چاہئیں' ہمارے مکانوں میں پانی ہونا چاہیے کیونکہ پانی کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے' صحن میں ایک آدھ پیڑ ہونا چاہیے جس کی چھاؤں میں ہم بیٹھ سکیں۔ ہمارے بیوی بچوں کو سستے داموں کپڑا ملنا چاہیے تاکہ وہ صاف ستھرے رہ سکیں۔ کیا انہیں علم نہیں کہ ہم میلے کپڑوں کو اسی طرح ناپسند کرتے ہیں جیسے وہ کرتے ہیں؟ ہماری تنخواہوں میں اضافہ ہونا چاہیے تاکہ ہم ذرا زیادہ آسانی کے ساتھ رہ سکیں۔ ہمارے گھروں میں بجلی لگنی چاہیے۔ کارخانے میں ہم دن بھر بجلی پیدا کرتے رہتے ہیں اور جب گھروں کو لوٹتے ہیں تو ہماری دیواریں اندھیرے میں کھڑی ہوتی ہیں اور تیل کا دھواں آنکھوں میں بھر جاتا ہے۔ کیسی شرم کی بات ہے۔ ہمیں اور ہمارے بچوں کو مل کے دواخانے سے مفت مشورہ اور دوا ملنی چاہیے۔ ہماری چھٹیوں میں اضافہ ہونا چاہیے۔ مشینوں کو بھی تیل کی ضرورت ہوتی ہے' کیا ہمیں آرام کی ضرورت نہیں؟ کیا ہم اس تھوڑی سی سہولت کے حقدار نہیں ہیں؟ کیا یہ بہت زیادہ ہے؟ ہم نے اٹھائیس دن تک نوٹس کے جواب کا انتظار کیا ہے اب اس کی گنجائش نہیں رہی۔ آج تک ہم نے مالکوں کے پیٹ کے لئے محنت کی ہے' آج ہم اپنے بچوں کے پیٹ کے لئے کام شروع کرتے ہیں۔''

ہر طرف سے نعرے بلند ہونے لگے۔

"وہ...... وہ" بشن نے علی کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔ "میری ماں ہے۔"

علی نے کچھ نہ سنا۔ وہ خلا میں اس جگہ کو گھور رہا تھا جہاں سے کمزور نوجوان چھلانگ لگا کر غائب ہو چکا تھا۔ یونین پریزیڈنٹ کی تیار شدہ بلند آہنگ تقریر کے مقابلے میں اس نوجوان کے سیدھے سادے الفاظ تیر کی طرح اس کے دل کو لگے تھے۔ جب وہ بول رہا تھا تو علی نے محسوس کیا تھا کہ پریزیڈنٹ کی تقریر کے مقابلے میں' جو کہ اس کے عالم فاضل دماغ سے نکلی تھی' یہ الفاظ سیدھے اس نوجوان کے دل سے' سیدھے اس کی زندگی سے نکل کر چلے آرہے تھے' کہ یہ نوجوان مزدور ان کا بھائی تھا اور سب کچھ جانتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی نعرے لگانے والوں میں شامل ہو گیا۔

پھر جانے کیسے ہوا کہ آناً فاناً علی نے اپنے آپ کو فیکٹری کی حدود کے اندر پایا۔ اسے اتنا یاد رہا کہ مالکان کے چند نمائندے آئے اور گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے مزدوروں کو ورغلانے لگے اور وہ کہ پہلے ہی ڈھلمل یقین تھا ان کے آگے لگ کر اندر چلا گیا۔ جلسے والوں کو جب پتا چلا تو گیٹ بند ہو چکا تھا۔ وہ سب پلٹ کر گیٹ پر جمع ہو گئے اور غضبناک آوازوں سے انہیں واپس بلانے لگے۔ چند ایک نے "ٹوڈی...... ٹوڈی" کی آوازیں بھی لگائیں۔ بشن جو اندر چلا آیا تھا' علی کے پاس سے نکل بھاگا اور دیکھتے دیکھتے لپک کر گیٹ پر جا چڑھا اور باہر کود گیا۔ باہر والے مزدوروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ باقیوں کو اندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر وہ گالیاں دینے لگے۔ علی نے عورتوں کے جلوس [illegible] چلا رہی تھی اور "ٹوڈی ٹوڈی" کی رٹ لگائے ہوئے تھی۔ علی نے اونچی آواز سے گالی دی اور مکا ہوا میں لہرایا۔ وہ اس عورت کو جانتا تھا۔ وہ شیلا ماتھر نام کی ہندو عورت تھی اور اب ایک مسلمان کے ساتھ رہتی تھی جس نے اس کا نام [illegible] رکھ دیا تھا۔

رات ہونے تک کئی بار اس نے گھر جانے کی اجازت چاہی لیکن اسے بتایا گیا کہ جو لوگ اندر آچکے تھے اب ہڑتال ختم ہونے تک باہر نہیں جا سکتے تھے اور ان کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کا بندوبست اندر ہی کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کو یقین دلایا گیا کہ وہ جو ہڑتال میں شامل نہیں تھے' مالکان کی نظر میں اونچی حیثیت رکھتے تھے چنانچہ ان کے گھر والوں کی دیکھ بھال کا ذمہ مالکان کے سر تھا اور اس کا خاطر خواہ انتظام کر دیا گیا تھا۔ لیکن عائشہ بیمار تھی اور وہ اس کے پاس جانا چاہتا تھا کیونکہ دو روز پہلے وہ ڈاکٹر سے اس کی دوائی لے کر آیا تھا جو وہ خود کبھی نہ پیتی تھی اور علاوہ اور سب باتوں کے اسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ دو ایک بار اس نے آپ سے آپ باہر جانے کی کوشش کی لیکن گیٹ بند تھا اور اس پر پولیس کے سپاہی تعینات کیے گئے تھے جنہوں نے اسے واپس بھیج دیا۔ اب رات پڑ رہی تھی اور وہ مایوس ہو چکا تھا اور اپنی کم عقلی پر پچھتا رہا تھا۔ اس کے برعکس اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ اگر اس وقت وہ باہر رہ جاتا تو اسے زبردستی پکڑ کر بھوک ہڑتال کرنے والوں کی ٹولی میں بٹھا دیا جاتا اور وہ دو ایک روز میں ہی مر جاتا۔ فیکٹری کو بہر حال ہڑتالیوں کی ہمت پست کرنے کی خاطر چلتے رہنا تھا۔

اب رات پڑ چکی تھی اور کل سترہ آدمی فیکٹری کو جا رہے تھے۔ تین انجینئر' پانچ فورمین' چار سپروائزر' دو فٹر اور تین مزدور۔ انجینئر اور فورمین تو مزدور یونین میں شامل نہ تھے چنانچہ بڑے صاف ضمیر کے ساتھ کام کر رہے تھے کہ یہ ان کی ڈیوٹی تھی۔ باقی سپروائزر اور فٹر اور مزدور ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی مرضی سے یونین کا ساتھ چھوڑ کر فیکٹری میں کام کرنے کو چنا تھا۔

علی کی ڈیوٹی مل ہاؤس میں تھی۔ یہاں پر دو ملیں تھیں۔ ایک مل میں پتھر پیسا جاتا تھا۔ دوسری مل میں وہی پسا ہوا پتھر جلائے جانے کے بعد جب 'کلنکر' بنتا تھا تو پیس کر سیمنٹ بنایا جاتا تھا۔ دونوں ملیں صرف پیسنے کا کام کرتی تھیں۔ جلانے کے لئے ایک الگ پلانٹ تھا جو 'کلن' کہلاتا تھا۔ مل ہاؤس میں عموماً پانچ آدمی ایک وقت میں کام کرتے تھے مگر اس وقت صرف دو آدمی تھے۔ ایک فورمین تھا جو بھاگ دوڑ کر ملوں کو چلا رہا تھا اور علی تھا جو ان کے بیرنگ (Bearing) کا تیل وغیرہ دیکھ رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے پمپوں کو جن کے ذریعے پسا ہوا مال اگلی منزل تک پمپ کیا جاتا تھا چلا رہا تھا۔ کام بہت آسان تھا کیونکہ تقریباً ساری مشینری خود بخود چلنے والی تھی' صرف نگرانی کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ فورمین کا کام بھی اکثر علی کو ہی کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ فورمین کے پاس چند ایک دوسرے پلانٹوں کا چھوٹا موٹا کام بھی تھا۔ علی اس کام سے بخوبی واقف تھا اور آسانی سے سرانجام دے رہا تھا۔

ایک گھنٹے سے اس کا فورمین غائب تھا اور وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات [illegible] کی طرح چل رہا تھا۔ ملیں مستقل چل رہی تھیں اور ان کی گڑگڑاہٹ میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی' بھاری مشینری کی گڑگڑاہٹ جو پہلے پہل آنے والے کے دل میں جوش اور بدن میں چستی پیدا کرتی ہے وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بھاری نیند اور اداس اور کڑی یکسانیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جاگنے کی کوشش میں وہ سر اٹھا کر بجلی کی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

اس کے سامنے دور و نزدیک اکا دکا جانے پہچانے لوگ مصنوعی جوش اور پھرتی کے ساتھ ادھر ادھر گزر رہے تھے۔ ان سب کے چہرے زیادہ دیر تک کام کرتے رہنے کی وجہ سے تمتمائے ہوئے تھے اور وہ اونچی اعصابی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ برسوں کی پرانی جانی پہچانی فیکٹری آج ایک عجیب و غریب انوکھی دنیا میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک نوجوان انجینئر کرین کو چلا رہا تھا۔ کرین جس کو عموماً علی کا ایک ساتھی چلایا کرتا تھا جس کو وہ اکثر وسل مار مار کر ملوں میں مال ڈالنے کی ہدایات دیا کرتا تھا۔ نوجوان انجینئر کو کرین چلانے کا معمولی تجربہ تھا چنانچہ اسے اس میں کافی دقت پیش آ رہی تھی اور علی' کہ اسے ناپسند کرتا تھا' یہ دیکھ کر عجیب سی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ اسی طمانیت کے احساس کو مکمل کرنے کے لئے علی اب تک تین بار جا کر منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں بجا بجا کر اور بازو ہوا میں لہرا لہرا کر اس کو ملوں میں مال ڈالنے کی ہدایات دے چکا تھا۔ ایک بار کرین کے شیشے میں سے انجینئر کا غضب ناک چہرہ دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکا اور بھاگتا ہوا اپنی جگہ پر آ کر ہنسی کے مارے دہرا ہو گیا۔ ایک انجینئر اور دو فورمین کلن (بھٹی) کو چلا رہے تھے۔ کوئلہ جو کہ کلن میں جلایا جاتا تھا' کہیں سے باہر نکل نکل کر اڑ رہا تھا اور تینوں

UrduPhoto.com